دورِ حاضر میں اجتہادِ اجماعی

(از الاستاذ محمد الغزالی، قاہرہ)

(مترجم: مولوی عبدالمبین صاحب ندوی، ناظم کتب خانہ دارالمصنفین، اعظم گڈھ)

زیرِ نظر مقالہ اب سے دو سال قبل الجزائر میں منعقد ہونے والی تنقوی کانفرنس میں استاد محمد الغزالی نے پیش کیا تھا جس میں موصوف نے علمی انداز میں بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ دورِ حاضر میں اجتہاد کی کیا ضرورت و اہمیت ہے، نیز واضح کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ نہ تو بند ہے اور نہ ہی ہر کس و ناکس پر وا ہے بلکہ اس کے لیے کچھ ضروری شرائط ہیں جن کا ایک مجتہد میں پایا جانا لازمی ہے اور ہر دور کے کچھ حالات ہوتے ہیں جو اجتہاد کا تقاضہ کرتے ہیں، افادۂ عام کی غرض سے اس کا اردو ترجمہ قارئین "برہان" کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

اس بیسویں صدی میں دین میں اجتہاد پر گفتگو ہر خاص و عام کا موضوع بن گیا ہے، خواہ وہ عوام ہوں یا خواص، علماء ہوں یا اسکالرس، ہر محفل و مجلس کا یہی موضوعِ سخن ہے، اور ہر ایک اسی موضوع پر اپنی رائے زنی اور اپنے مخصوص نظریہ کے مطابق اس کی تشریح و توضیح کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق جس قدر گفتگو زیادہ ہوتی ہے معاملہ اسی قدر پیچیدہ ہو جاتا ہے، اور نفسِ موضوع کی وضاحت و تشریح رہ جاتی ہے اور اجتہاد کو عوام کے لیے ایک کھلی چھوٹ (open Licence) سمجھ لیا گیا ہے۔ تاکہ وہ خدا کے دین میں اپنی من گھڑت باتیں کہہ سکیں، اور شرعی امور میں اپنی من مانی رائے ظاہر کریں اور اس میں وہ چیز داخل کر دیں جس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور وہ چیز خارج کر دیں جو شارعِ اسلام پر نازل ہوئی ہے اور جس پر امت کا عمل رہا ہے، اور یہ سب کچھ اجتہاد، تجدد، اور تقاضۂ زمانہ کی

تقلید و اتباع میں کیا جاتا ہے۔ یا اس بیسویں صدی میں ہماری طرز معاشرت کو دلیل و بنیاد بنا کر کہ انسان اس صدی میں وہ نہیں رہا جو پہلے تھا بلکہ اب دوسری مخلوق بن گیا ہے اس لیے وہ سائنس و ترقیاتی تجربہ ایٹم بم اور مہلک راکٹ اور برق رفتار مواصلات کے وسائل کی فراہمی کے بعد آسمانی ہدایتوں سے مستغنی اور بے نیاز ہو گیا ہے ایسے لوگوں کی عرب ممالک میں بہت سی مثالیں ملیں گی جنہوں نے مغرب کو اپنا شعوری یا غیر شعوری طور پر معبود تسلیم کر لیا تھا اور اسلام کی بنیاد ڈھانے پر تل گئے تھے اور اسلامی اساس کی تشکیل نو مغربی طرزِ فکر پر کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا اس نظریہ کی نمائندگی سید احمد خان، طٰہٰ حسین، اور علی عبدالرزاق وغیرہ کرتے تھے جن سے اور بہت سے لوگ متاثر ہو چکے تھے۔

حالانکہ مجھے اس سے انکار نہیں کہ یہ لوگ اپنی مخلصانہ نیتوں کے سبب اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ایک نتیجہ تک پہنچ چکے تھے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کے خلوص کی وجہ سے ان کی رائیں بھی حق بجانب ہی رہی ہوں (جس کی کوئی ضمانت نہیں) جس نے عوام کے ایک طبقہ کے ذہنوں کو زبردست متاثر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں استعمارانہ سیاسی، فکری و اقتصادی ماحول نے بھی مدد پہنچائی ہے۔ ان گہرے اثرات کی بنا پر ان کے یہاں غلامانہ اور شکست خوردہ عقلیت کی جماعت بن گئی، جو حضرت موسیٰؑ و ہارون علیہما السلام کے رب سے سرکشی کر کے مارکس اور قارون کے رب پر ایمان لے آئی ہے۔ کیا یہ وہی مادیت نہیں جو سب سے بڑا بُت ہے جس کو بشریت نے اپنے ہاتھوں سے گڑھ کر اپنا معبود بنا لیا ہے۔؟

دوسری جانب ہم ایک جماعت کو دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنا الگ موقف ہی بنا لیا ہے جو انتہا پسندی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ (ether Extreme) اور جو شریعت کو صرف دسویں صدی ہجری کی زبان و اصطلاح میں سمجھتی ہے اور اس کو جامد و معطل شکل میں پیش کرتی ہے۔ جس میں اجتہاد و توسّع کی قطعی طور پر کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے، ان کی فہم و فراست کی آخری حد اور ان کا مبلغِ علم فتاویٰ کی بعض کتابیں اور چند فقہی نصوص سے زیادہ نہیں ہوتا۔

چنانچہ ان کے نزدیک تفقہ کا مطلب یہ ہے کہ فقہ کی سمجھ اور متاخرین کی آراء سے واقفیت حاصل ہو جائے؛ اس سے مطلب نہیں کہ شریعت کی فقہ کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کے ردّ عمل کا نتیجہ ہیں۔ بسا اوقات اس قسم کے آزاد نظریہ کا اظہار، ہونے والے کے استحکام و ثبوت کا سبب بن جاتا ہے اور اپنے ہم فکر و ہم خیال لوگوں کو اپنے جامد نظریات پر سختی سے قائم رکھتا ہے۔

عرصہ سے ان دونوں انتہا پسند طبقوں کے درمیان بُعد بڑھتا گیا، جو اب تک برابر قائم ہے۔ اور علماء ان دو طبقوں میں بٹے رہے۔ چنانچہ بعض کا کہنا ہے کہ "اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے، اب اس کو کوئی کھول نہیں سکتا یعنی قیامت تک اس کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے" اور چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔ اور علماء ہی کا ایک دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ "اجتہاد کا دروازہ (یعنی اس کا دونوں پٹ) پوری طرح کھلا ہے" اور ہر نئی بات کا خیر مقدم کرتا ہے اور اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ذہنوں کو تشویش میں مبتلا کر دے اور خیالات میں انتشار پیدا کر دے۔ اس طرح سے لوگ مختلف قسم کی باتیں کرتے ہیں جس کا اعادہ بے سود ہے اور موضوع بھی طویل ہو جائے گا۔ بہر نوع جب ہم اس فکری انتشار اور علمی انارکی پر غور کیا کرتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مخلوق ارضی کے ساتھ برائی کا قصد کیا گیا ہے یا ان کے ساتھ ان کا رب خیر و بھلائی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے۔

اجتہاد کی تعریف اور اس کی قسمیں | اجتہاد کی تعریف میں تو علماء متفق ہیں البتہ اس اصطلاحی تعریف میں فقہاء میں کچھ اختلاف ضرور پایا جاتا ہے۔ یہاں ہم امام غزالیؒ کی عبارت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ موصوف کے نزدیک "اجتہاد کے لفظی معنی کسی کام میں اپنی بھرپور کوشش اور صلاحیت کی لگا دینا ہے اور اس لفظ کا استعمال اسی کام میں کیا جاتا ہے جس میں تکلیف و مشقت پائی جاتی ہو" اور فقہ کی اصطلاح میں "اجتہاد" مجتہد کی اس کوشش اور محنت کو کہتے ہیں جسے وہ شرعی احکام کے معلوم کرنے میں صرف کرتا ہے۔[۵] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس اعتبار سے اجتہاد کی مختلف قسمیں ہیں مگر جس مسئلہ کے سلسلہ میں اجتہاد کیا جائے اس کی دو قسمیں ہیں۔

اول: ایسا اجتہاد جو نص کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے ایسے اجتہاد میں قواعدِ کلیہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قواعد کلیہ کا علم ایک دلیلِ اجمالی ہے مثلاً عام اور مطلق کی دلالت فقہائے احناف کے نزدیک قطعیۃ الدلالۃ ہوتی ہے اسی لیے عام اور مطلق کے حکم کو خبر آحاد سے مخصوص و مقید نہیں کیا جا سکتا مگر یہ حکم خود کسی تخصیص یا تقلید کی وجہ سے ظنی الدلالۃ ہو، یا جیسا کہ شافعی فقہا کہتے ہیں کہ عام اور مطلق حکم ظنی الدلالۃ ہوتا ہے۔ اس لیے خبرِ واحد سے اس کی تخصیص کی جا سکتی ہے۔

دوم: اجتہاد کی دوسری قسم وہ ہے جس میں غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جس مسئلہ میں کوئی حکم یا نص وارد ہے اور وہ متفق علیہ مسئلہ ہے[۱] اس پر مجتہد قیاس کر کے جس مسئلہ میں کوئی نص یا اجماع نہیں ہے، اس کا استنباط کرے گا۔ جیسا کہ عام شرعی قواعد سے حکم مستنبط کیا جاتا ہے جس کو بعض فقہا کی اصطلاح میں "اجتہاد بالرائے" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں اجتہاد کی ضرورت: آج ہمیں اجتہاد کی جس قدر ضرورت ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور اس وقت مسائل روز بروز بڑھتے اور مختلف ہوتے جاتے ہیں اور اس امتِ مسلمہ پر جو بھی سورج طلوع ہوتا ہے، وہ مسائل کا ایک نہ ایک انبار لے کر طلوع ہوتا ہے جو اسلامی شریعت کی روشنی میں حل طلب ہوتے ہیں۔ یہاں ہم مثال کے طور پر چند جدید پیش آمدہ مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو اجتہاد کی دعوت دیتے ہیں، تاکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا حل تلاش کیا جائے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) [۱] المستصفی، امام غزالیؒ۔ مطبوعہ مکتبہ تجاریہ الکبریٰ قاہرہ۔ ۱۳۵۶/۱۹۳۷ء ج ۲/ص ۱۰۱۔

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا وہ عہد معاشرہ جس میں مسلمان اقلیت میں رہتے ہوں۔ خاص طور سے سیکولر اور جمہوری ممالک جس میں کسی دین و مذہب کو کوئی قانونی و سرکاری حیثیت حاصل نہ ہو، ایسے ممالک میں مسلمانوں کو ان مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو موجودہ ماحول کی دین ہیں جن کا ہمارے فقہائے کبار نے کوئی حل تلاش نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ ان فقہاء کے دور میں مسلمانوں کو اس قسم کے مسائل پیش ہی نہیں آئے تھے جن کے بارے میں کچھ سوچا جاتا۔

(۲) مسلمانوں کے تعلقات غیر مسلموں سے سیکولر ممالک میں کس طرح ہوں (خواہ وہ ممالک دار الحرب ہوں یا دار الامن یا موجودہ حالات میں ہم جو بھی نام رکھ لیں۔

(۳) مسلمانوں کی روش اور ان کا رویہ مشرک و لامذہب حکومتوں کے ساتھ کیسا ہو؟ بالخصوص کمیونزم حکومتوں کے ساتھ۔ کیونکہ بعض کمیونزم حکومتیں اپنے ہم وطنوں کو کسی دینی نشاط و سرگرمی کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔

(۴) کیا مسلمانوں کا رویہ غیر مسلم حکومتوں سے سلبی اور منفیات پہلو سے جو زیادہ ایجابی و مثبت طریقہ اختیار کریں۔؟

(۵) اسلامی شرعی احکامات اور جدید طریقۂ کار کے مابین تعمیری و ایجابی تعلقات کس طرح قائم کیے جائیں۔ کیونکہ الکشن، ووٹنگ، پارلیمنٹ ہاؤس، اور مجلس شوریٰ کی تشکیل نیز چیک اور بینک بیلنس Cheque and Bank balance اور اسی طرح کے جدید مسائل اسلامی نظریہ کی تائید اور اس کا حل چاہتے ہیں جو متفق علیہ بھی ہوں۔

(۶) مشینری آلات کے ذریعہ جدید اقتصادی نظام کی تعمیر اور اسے مستحکم بنانے کے لیے شرعی احکام سے کس حد تک مدد حاصل کی جا سکتی ہے؟ اور شریعت کے مقاصد کے بر لانے میں کہاں تک اس سے کامیابی ہو سکتی ہے۔؟

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس موضوع پر گفتگو کریں کہ ان مذکورہ مسائل کے حل کرنے میں

اجتہاد کا کیا کردار رہا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ واضح کر دیں کہ جو لوگ اجتہاد کے تجزیاتی امکان کے قائل ہیں، ان کے نزدیک اجتہاد کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اجتہاد مطلق: تمام شرعی احکام میں از اول تا آخر اجتہاد کیا جا سکے۔

(۲) اجتہاد مقید: وہ اجتہاد جس کے ایک حکم میں اجتہاد ہو سکتا ہے اور دوسرے میں نہیں جس کے ذریعہ بعض احکام و مسائل کے استنباط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جس کو فقہائے احناف "نوازل" کہتے ہیں۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ ہر وہ شرعی حکم جس کے سلسلہ میں کوئی قطعی دلیل وارد نہ ہو۔ وہ محلِ اجتہاد ہے؟ البتہ اُن مسائل میں اجتہاد جائز نہیں جن کا ثبوت دلیلِ قطعی سے پایا جاتا ہے جیسے پنج وقتہ فرض نمازیں، زکوٰۃ اور باقی ارکانِ اسلام وغیرہ، اور اس میں شک نہیں کہ "وہ حوادث و مسائل جو انسانی تصرفات کا نتیجہ ہیں جن کی تحدید ممکن نہیں۔ یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ ہر پیش آنے والے نئے مسائل کا ہمیں شریعت کی طرف سے کوئی صریحی حکم نہیں ملتا اور ایسا ہونا ممکن بھی نہیں چنانچہ جب نئے مسائل اور حادثات کا سلسلہ لامتناہی ٹھہرا اور قرآن کریم اور صریح احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام محدود ٹھہرے تو ایک محدود چیز کسی لامحدود کو اپنے اندر سمونے کی گنجائش نہیں رکھ سکتی ہے۔ قطعی طور سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اجتہاد اور قیاس ایسی چیزیں ہیں جن کی قیمت و اہمیت ہر زمانہ میں باقی رہے گی۔ جب تک نئے نئے حالات پیدا ہوتے رہیں گے، اور کیفیات بدلتے رہیں گے اور نئے مسائل و مشکلات سامنے آتے رہیں گے، اس وقت تک اجتہاد کی ضرورت باقی رہے گی اس لیے کہ ہر نیا مسئلہ اجتہاد کی دعوت دیتا رہے گا۔[۱]

اجتہاد میں تقسیم نہیں ہے | اجتہاد میں تقسیم و تجزی کا مسئلہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ محققین کا عام رجحان یہی ہے کہ اجتہاد کوئی منصب نہیں جس میں تجزی و تقسیم نہ ہو سکے، بلکہ جائز ہے۔

[۱] الملل والنحل امام شہرستانی۔

کہ ایک عالم کسی خاص مسئلہ میں درجۂ اجتہاد رکھتا ہو اور دوسرے میں اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہوں۔ اس لیے جو شخص بھی قیاسی مسائل میں وقتِ نظر رکھتا ہے اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ قیاسی مسئلہ میں اجتہاد کر کے فتویٰ صادر کرے، اگرچہ علم حدیث میں مہارت تام حاصل نہ ہو۔ اور جو شخص وراثت کے مسئلہ مشترکہ میں نظر رکھتا ہو اس کے لیے علم الفرائض کے اصول ومعانی کا جاننا کافی ہوگا۔ اگرچہ اس کو ان احادیث میں درک حاصل نہ ہو۔ جو مسکرات کی حرمت، یا نکاح بلا ولی کے مسئلوں میں وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ ان مسئلوں میں وسعتِ نظر یا ان سے متعلقہ احادیث کی واقفیت سے مذکورہ مسئلوں کا کوئی تعلق نہیں اور اس کی عدم واقفیت نقص نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جو شخص ایسی احادیث کا علم رکھتا ہے جو مسلمان کے کسی ذمی کے قتل اور اس کے مال وغیرہ میں تصرف کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، اگر وہ علم نحو کے اس مسئلہ سے ناواقف ہو جس سے "وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ"، کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو تو اس کے مرتبۂ اجتہاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح دوسرے مسئلوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اور نہ ہی مفتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر مسئلہ کا جواب دے سکے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے چالیس مسئلوں کے بارے میں سوال کیا گیا جس میں چھتیس مسئلوں کے متعلق فرمایا کہ "لا اَدری" یعنی میں نہیں جانتا ہوں۔ ایسے ہی کتنی بار امام شافعیؒ نے جواب دینے سے توقف کیا ہے۔ بلکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی متعدد مسائل میں جواب دینے سے احتیاط برتی ہے۔[۱]

شرائطِ اجتہاد کے لیے جن چیزوں کا جاننا ضروری ہے، فقہائے اسلام نے ان پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور شاید اسی ضمن میں سب سے عمدہ بات جس نے لکھی ہے وہ امام غزالیؒ ہیں جنھوں نے اپنی کتاب المستصفیٰ جلد دوم میں اس کا ذکر کیا ہے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک

---

[۱] المستصفیٰ امام غزالیؒ جلد دوم ص ۱۰۳۔

منصب اجتہاد پر فائز ہونے کے لیے جن علوم کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہیں۔
(۱) قرآنِ کریم۔ (۲) حدیثِ نبوی، (۳) اجماع (۴) قیاس، (۵) دلائل اور اس کے شرائط کو اچھی طرح جاننا، یہ دونوں علم مقدم ہیں۔ (۶) لغت، ونحو سے واقفیت۔ (۷) ناسخ ومنسوخ سے واقفیت، یہ دونوں علم تتمہ ہیں۔

(المستصفیٰ جلد دوم۔ ص ۱۰۱۔ ۱۰۲)

اب قارئین کی خدمت میں اس اجمال کی تفصیل مستصفیٰ الکتاب کی ہی روشنی میں پیش کی جاتی ہے۔

قرآن کریم (۱) پورے قرآن کریم کی معرفت اور اس پر عبور ہونا مشروط نہیں۔ بلکہ احکام سے متعلق جو آیتیں ہوں۔ ان کا علم ضروری ہے اور وہ پانچ سو کی مقدار میں ہیں۔
(۲) وہ آیتیں جو احکام سے متعلق ہوں ان کا حفظ ہونا بھی شرط نہیں۔ بلکہ ان آیتوں کے مواقع سے آگاہ ہونا چاہیئے تاکہ ضرورت پڑنے پر انھیں تلاش کرلیا جائے۔

حدیث نبوی صلعم (۱) اسی طرح ان احادیث سے واقفیت ضروری ہے جو احکام سے متعلق ہوں۔ ایسی حدیثیں اگرچہ ہزاروں سے زیادہ ہیں، پھر بھی وہ محدود ہی ہیں۔
(۲) ان احادیث کا جاننا ضروری نہیں، جو مواعظ ونصائح اور احکام آخرت سے متعلق ہوں۔
(۳) ان احادیث کا زبانی یاد ہونا بھی ضروری نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس شخص کے پاس احکام سے متعلق احادیث کے تمام صحیح نسخے موجود ہوں، مثلاً سنن ابوداؤد، معرفۃ السنن امام احمد بن حنبلؒ اور سنن بیہقی وغیرہ۔ یا اس کے علاوہ کوئی ایسی اصل موجود ہو جس میں احکام سے متعلق تمام حدیثیں موجود ہوں اور مجتہد اس کے تمام ابواب وفصول سے بھی واقف ہو تاکہ بوقت ضرورت مثلاً فتویٰ وغیرہ دیتے وقت اصل سے مراجعت کرسکے۔ اور اگر ان احادیث کے حفظ پر قادر ہو، تو یہ اور زیادہ بہتر واولیٰ ہے۔

اجماع مجتہد کو چاہیے کہ اجماع سے واقفیت ہو، تاکہ غیر اجماع میں فرق کر سکے تاکہ اجماع کے خلاف فتویٰ نہ صادر کر دے۔

(۲) اسی طرح مجتہد کے لیے نصوص سے بھی واقفیت بہت ضروری ہے، تاکہ نص قطعی کے خلاف فتویٰ نہ دے ... اس اصل میں اتنی آسانی محسوس کی گئی ہے کہ اجماع اور غیر اجماع کے تمام موقعوں کا حافظ ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ جس مسئلہ کے متعلق فتویٰ صادر کرے اس میں یہ علم ہونا چاہیے کہ اس کا فتویٰ اجماع کے مخالف تو نہیں ہے۔ البتہ معلوم ہو کہ یہ فتویٰ علماء کے مسالک میں سے کس مسلک کے مطابق ہے۔ خواہ وہ کسی بھی امام کا مسلک ہو، یا معلوم ہو کہ یہ واقعہ موجودہ زمانہ کا پیدا شدہ ہے جس کے بارے میں اہلِ اجماع کی کوئی تحقیق نہیں ہے۔ اتنی معلومات اجماع کے سلسلہ میں کافی ہے۔

قیاس اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ احکام کے منفی پہلو کا اسے علم ہو، اس لیے کہ عقل قولی اور عملی احکام میں نفیِ حرج پر رہنمائی کرتی ہے، یعنی وہ تنگی میں مبتلا ہونے سے روکتی ہے اور اس کی اتنی صورتیں ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس میں جو نقلی احکام کتاب و سنت کے دلائل سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں، وہ محدود ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہر نئے واقعہ میں سب سے پہلے منفی پہلو اور براءتِ اصلیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

دو باتوں کا علم مقدم ہے اور وہ چار علوم جن کے ذریعہ طریقِ استثمار یعنی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے ان میں دو باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔

(۱) مجتہد کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسے شرائط کی پوری معرفت ہو تاکہ اس کے قائم کردہ دلائل اور براہین کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں نتیجہ خیز ہو سکیں۔

(۲) ... عربی لغت و زبان اور نحو و صرف پر کامل عبور ہو، کہ عربوں کے طرزِ خطاب اور ان کے لب و لہجہ اور عادات ... کو بآسانی سمجھ سکے۔ مثلاً حقیقت و مجاز، عام و خاص، محکم و متشابہ، مطلق، مقید، نص، ... سیاق کلام وغیرہ، اور بالخصوص قرآن و حدیث سے

براہ راست استفادہ کر سکتا ہو۔

البتہ اس میں اتنی رعایت ہے کہ عربی زبان وقواعد کے علم میں یہ ضروری نہیں کہ وہ خلیل ومبرد نحوی کے مقام تک پہنچا ہو، اور زبان کی دقت ووسعت معلومات رکھتا ہو بلکہ قرآن وحدیث سے متعلق نحوی قواعد سے واقفیت کافی ہے۔ جس سے خطاب کے مواقع کو سمجھ سکے اور اس کے ذریعہ مقاصد کے حقائق کا ادراک کر سکتا ہو[1]

ان سب کے علاوہ ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ عوام کی ضروریات ان کے تقاضے ان کی عادات وخصائل سے بھی واقفیت رکھتا ہو، اس لیے کہ شریعت الٰہی عوام ہی پر جاری ونافذ کی جاتی ہے، اور عوام کے ماحول ومعاشرہ پر اس کا نفاذ ہوتا ہے اور مجتہد عامۃ المسلمین کی عادات وخصائل سے واقف ہوئے بغیر کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ امام ابن قیمؒ اس واقفیت ومعلومات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"جس شخص نے عوام کے عرف وعادات زمانہ وحالات اور اس کے سیاق وسباق کو سمجھے بغیر محض کتابوں کی منقول روایتوں کی روشنی میں فتویٰ صادر کر دیا تو وہ شخص خود گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور ایسے مجتہد کا جرم دین کے حق میں اس طبیب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے جس نے تمام لوگوں کا ایک ہی علاج کیا ہو اور ان کے وطن، عادات زمانہ سے واقف نہ ہوا ہو۔ یہ جاہل طبیب اور وہ جاہل مفتی عوام کے دین اور ان کے جسم کے سلسلہ میں دونوں ہی زیادہ نقصان دہ ہیں"[2]

اجتہاد اجتماعی کے لیے ہماری دعوت | اجتہاد کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں (۱) اجتہاد شخصی (۲) اجتہاد اجتماعی۔ بلاشبہ شریعت اسلامیہ انہی دونوں قسموں میں اجتہاد کے مزاولت کی دعوت دیتی ہے اور کبار فقہائے مجتہدین مثلاً امام اوزاعیؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ وغیرہ نے

[1] المستصفیٰ ج ۲، ص ۱۰

[2] اعلام الموقعین امام ابن قیم ج ۳، ص ۷۸

اول الذکر اجتہاد کا فریضہ انجام دیا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے قبولیتِ عامہ کا شرف بخشا لیکن بدور عہد سے ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ ثانی الذکر یعنی اجتہاد اجماعی۔ کبار فقہاء کے مابین جاری وساری رہا ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدین خاص طور پر شیخان (یعنی حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ) اجتہاد شخصی کی طرف سبقت نہیں کرتے بلکہ جو مسائل ومشکلات پیش آتیں، انھیں اصحاب علم وفقہ کے سامنے پیش کرتے، تاکہ ان میں کا ہر شخص معاملہ کی نزاکت کا بغور مطالعہ کرکے کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار کرے، اس طرح وہ اجتہاد کرتے، اور کسی آخری نتیجہ پر پہنچتے

امام بخاریؒ، امام دارمیؒ، امام بیہقی سے منقول ہے، کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا، تو سب سے پہلے کتاب اللہ میں تلاش کرتے اور اگر اس میں اس کا حل مل جاتا تو اسے نافذ فرمادیتے، اور اگر قرآن کریم میں اس مسئلہ کا ذکر نہ ہوتا تو سنت نبوی کی طرف رجوع فرماتے، اگر اس میں مسئلہ کا حل پا جاتے تو اس پر عمل کرتے اور اگر اس میں بھی مسئلہ کا حل نہ ملتا تو رؤسائے مسلمین اور علمائے کرام کو بلاتے اور اُن سے پیش آمدہ مسئلہ کے سلسلہ میں مشورہ طلب فرماتے، جب کسی ایک مسئلہ پر ان سب کا اتفاق ہوجاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے[1]

امام باقلانی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کوئی حکم نافذ کرنا چاہتے تو اپنے فضل وکمال، وسعتِ نظر وفقہ، اور حدیثِ نبوی کی معرفت وشناخت نیز ارکانِ قیاس واحکام کے اخذ کرنے میں ملکہ رکھنے کے باوجود پہلے صحابہ کرامؓ کو اکٹھا کرکے ان سے رائے ومشورہ فرماتے، اس کے بعد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجمع عام میں اس کا اعلان فرماتے تھے[2]

---

[1] بیہقی، سنن کبریٰ، مطبوعہ حیدرآباد، ج ۱۰ ص ۱۱۴، ۱۱۵۔

[2] کتاب التمہید، امام ابوبکر باقلانی ۱۹۴۶ء، ص ۲۰۰۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ خلفائے راشدین کسی ایک مسئلہ پر اپنے اصحاب علم کے ساتھ مہینہ بھر غور و مطالعہ فرماتے رہتے، چنانچہ امام عامر شعبی سے مروی ہے کہ مسئلہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا جاتا اور بسا اوقات مہینہ بھر اس کی گہرائی تک پہنچ کر غور کرتے اور اپنے صحابۂ کرامؓ سے مشورہ طلب فرماتے۔[۱]

اجتہادِ اجتماعی کی چند اہم مثالیں حضرات خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی درج ذیل ہیں:

(۱) تدوین قرآن کا مسئلہ۔

(۲) مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد۔

(۳) جدّہ کا میراث میں حصہ

(۴) سواد کی اراضی کی عدم تقسیم، نیز دیگر مسائل۔

پھر امام ابوحنیفہؒ نے علماء و فقہاء، مفسرین و محدثین، اصحاب جرح و تعدیل، علمائے کلام و لغت کی ایک بڑی جماعت پیدا کر دی جس نے فقہ حنفی کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا جس سے تابعین و تبع تابعین کے عہد کے اجتہاد کی ایک اچھی مثال قائم ہو گئی۔ لیکن اجتہاد اجتماعی کا یہ طریقہ جس کی بنا امام ابوحنیفہؒ نے ڈالی تھی آپ کے بعد باقی نہ رہ سکا۔ اگر اپنی سابقہ روایت پر یہ سلسلہ جاری رہتا تو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بے حد مفید ثابت ہوتا لیکن آخری صدی میں اس سنت کے احیاء کا سہرا سلاطین عثمانیہ کے سر ہے جنھوں نے اس مقصد کے لیے اہل علم کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور اس میں شک نہیں کہ رسالہ احکام عدلیہ کی تدوین فقہ۔ علماء کی جانب سے ان اسکیموں میں سے ایک اہم اسکیم ہے جو اس دور میں "اجتہاد اجتماعی" کے لیے تیار کی گئی ہے۔

---

[۱] مبسوط، امام سرخسی، ج ۱۶، ص ۱۳۳۔

وہ اسباب جو "اجتہاد اجماعی" کی مشق و مزاولت کا تقاضہ کرتے ہیں	آج مسلمانوں میں ایسی شخصیتیں مفقود ہیں جو علم و معرفت اور زہد و اخلاق میں بلند مرتبت ہوں، جن کے فتاوی

کو عامۃ المسلمین آج بھی اسی طرح قبول کر لیتے ہوں جس طرح ماضی میں علمائے سلف کے فتاوی قبول کر لیتے تھے۔

(۲) مسلمان ۴۰ سے آزاد حکومتوں میں منقسم ہیں، ایسی صورت میں اگر "اجتہاد شخصی" عہد اول کی طرح جاری رکھا جائے گا، تو اس سے بجائے کوئی مسئلہ حل ہونے کے مزید اختلاف و افتراق رونما ہوگا۔ چنانچہ ایک ہی وقت میں پاکستانیوں کا اجتہاد اس سے مختلف ہوگا، جو مصریوں کا اجتہاد ہوگا اور جس نتیجہ پر سعودی پہنچیں گے اس سے الجزائر والوں کا اجتہاد جدا ہوگا، اور بڑھتے بڑھتے یہ اختلاف شریعت کے جائز حدود کو بھی توڑ جائے گا اور یہ ایسا معاملہ ہے جس سے دشمنانِ اسلام کو ہم پر اور ہمارے دین پر استہزا کا موقع ملے گا۔

(۳) اگر حکومت معاشرہ کے تمام معاملات میں دخل دے تو بغیر اجتہاد شخصی کے مشکلات پیش آئیں گی اور موجودہ مروجہ مسائل میں پورے طور سے آزادیٔ رائے کا اظہار بھی مشکل مسئلہ ہوگا لیکن علمائے عرب کے مابین اتفاق رائے اور فکری ہم آہنگی انھیں وہ مقام و مرتبہ عطا کرتی ہے جسے کوئی ظالم و جابر حکمران ان سے چھین نہیں سکتا ہے۔ جن دشوار و پیچیدہ مسائل کی طرف فکر و نظر اور دل و دماغ کو بار پانا مشکل تھا، اب اس کی جانب امتِ مسلمہ کی بہترین پیش رفت شروع ہو چکی ہے اور امت نے یہ محسوس کیا ہے کہ "اجتہادِ شخصی" سے "اجتہاد اجماعی" کہیں زیادہ محتاط، اطمینان بخش اور درست ہے، خاص کر ایسے دور میں جس میں فساد بڑھ چکا ہو، وسیع الفکر علما، جنس نایاب بن چکے ہوں، صالحیت اور زہد و تقویٰ میں فتور آ گیا ہو۔ اس دور میں ایسی شخصیتیں نہیں ملتیں جو تمام علوم میں کامل دستگاہ رکھتی ہوں اور ان کو علوم شرعیہ کی تمام قسموں میں تعمق کا درجہ حاصل ہو جس طرح کہ سلف صالحین کو حاصل تھا، اور آج عالم اسلام میں جو لوگ اپنی علمیت و ہمہ دانی کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کی اکثریت اپنی صالحیت و تقویٰ